حضرت مولانا محمد سالم قاسمی کی زندگی: علم وحکمت کا نمونہ، صبر و استقامت کی مثال

از: بدر الحسن القاسمی (کویت)

عربی زبان کے صاحب طرز ادیب اور نامو قلم کار و مصنف احمد امین نے موت کے سامنے انسان کی بے بسی کی تعبیر ایک جملے میں یہ کہہ کر کی ہے کہ «الموت قافیۃ کل حی» یعنی ہر ذی روح کا انجام موت ہے۔ اور حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے موت کے خوف سے پریشان اور بے چین ایک مریض کو تسکین دلاتے ہوئے کہا کہ: ''تم یہ سمجھ کر خوف زدہ ہو کہ تمہاری بیماری سنگین اور مہلک ہے۔ لیکن تم یہ کیوں بھول گئے کہ انسان کی زندگی خود ہی ایک مہلک بیماری ہے جس کو لگ گئی اس کو مرنا ہی ہے۔''

اور سب سے بڑھ کر خود قرآن کریم کی یہ معجزانہ اور بلیغ تعبیر ہے «کل نفس ذائقۃ الموت» یعنی «ہر ذی روح کو موت کا مزا چکھنا ہی ہے۔»

لیکن یہی موت کسی کے لیے زندگی اور شہادت و سعادت کا پیام بن کر آتی ہے اور کسی کے لیے دائمی شقاوت کا آغاز ہوتی ہے۔

لاکھوں انسان ہر دن سطحِ زمین سے زیرِ زمین منتقل ہوتے ہیں لیکن انہیں میں کچھ ایسی پاکیزہ اور سعادت مند روحیں بھی ہوتی ہیں جن کے گزر جانے پر کون و مکان غم زدہ ہوتے ہیں اور زمین و آسان ان پر آنسو بہاتے ہیں اور زمین پر ان کی جائے عبادت اور آسمانوں میں ان کے اعمال کی رسائی کی جگہ ان پر ماتم کرتی ہیں۔

مولانا سالم قاسمی کی وفات

خانوادۂ قاسمی کی عظمت کے عصر حاضر میں نشان نامور عالم دین اور بے مثال خطیب اور ناموس رسالت کے محافظ استاذ گرامی حضرت مولانا محمد سالم القاسمی کی دیوبند میں وفات ایک ایسا ہی سانحہ ہے جس پر زمین و زمان اور ارض و سما بھی ماتم کناں ہیں۔ مولانا محمد سالم قاسمی اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی ہیں جس کا ایک سرا حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی

ہیں تو دوسرا اسرا حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ آپ کی پیدائش ۸/ جنوری ۱۹۲۶ء کو ہوئی اور وفات کی تاریخ ۱۲/ اپریل ۲۰۱۸ء ہے۔ اس طرح آپ کی حیاتِ مستعار ۹۲ سال سے کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ لیکن ایک عالَم ہے جو آپ کی وفات پر افسردہ ہے اور ایک دنیا ہے جو آپ کے درجات کی بلندی کے لیے دعائیہ کلمات اور تعزیت وایصال ثواب میں مشغول ہے، جو آپ کی عند اللہ مقبولیت کی دلیل کہی جاسکتی ہے۔ جنازے میں شرکا کی کثرت بھی فالِ نیک ہے۔

کچھ لوگوں کی زندگیاں پوری دنیا کیلئے راحت وسعادت کا باعث ہوا کرتی ہیں۔ ایسے لوگوں کا اٹھ جانا یقیناً امت کے لیے بڑے خسارے کی بات اور زبردست سانحہ اور المیہ ہوا کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ائمۂ دین کو لوگ ہمیشہ یاد کیا کرتے ہیں۔

مشہور واقعہ ہے کہ امام احمد بن حنبل سے ان کے بیٹے عبداللہ بن احمد نے دریافت کیا کہ کیا بات ہے آپ صبح وشام امام شافعی کے لیے دعائیں کیا کرتے ہیں۔ آخر یہ امام شافعی کیا چیز ہیں؟ تو انھوں نے فرمایا کہ بیٹے، امام

شافعی دنیا کے لیے آفتاب اور لوگوں کے لیے عافیت (کالشّمس للدنیا و کالعافیۃ للناس) کی حیثیت رکھتے ہیں۔

میں نے اپنے ایک مضمون میں یہ جملہ حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب کی وفات حسرت آیات پر لکھا تھا اور فرق مراتب کے ساتھ یہ بات مولانا محمد سالم صاحب پر بھی صادق آتی ہے۔

مولانا سالم کی خطابت

خطابت کے ذریعے ان کا فیض ملک و بیرون ملک عام تھا۔آپ کے فیض یافتوں اور شاگردوں کا طبقہ ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ حضرت حکیم الاِسلام کے سایۂ عاطفت میں آپ کی پرورش اور دارالعلوم دیوبند کے علمی ماحول میں آپ کی تعلیم وتربیت ہوئی۔اور آپ کو حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے براہ راست پڑھنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی تھی۔ اور امام معقول و منقول علامہ ابراہیم بلیاوی، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، شیخ الأدب مولانا اعزاز علی امروہی اور پیر ذہانت و فطانت حضرت مولانا فخر

الحسن مرادآبادی جیسے اساطین علم و فضل سے آپ کو اکتساب فیض کا موقع ملا۔ علم و حکمت حضرت نانوتوی کی وراثت تھی اور خطابت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب کا فیضِ نظر؛ جن کی شان کا خطیب نہ ان کے معاصرین میں کوئی نظر آتا ہے اور نہ ان کے بعد، جو بغیر کسی چیخ و پکار اور خطیبانہ بلند آہنگی کے انتہائی نرم لہجے اور دھیمے آواز میں اپنی قوت استدلال اور بیان کے تسلسل سے گھنٹوں سامعین کو مسحور رکھتے اور جن کے بیان کی طوالت کے ساتھ لوگوں کی تشنگی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ ماضی میں امام ابن الجوزی کی وعظ کی مجلسوں کی یہ شان بیان کی جاتی تھی کہ اُن کا وعظ سننے کے اشتیاق میں لوگ ایک دن پہلے ہی سے جمع ہونا شروع ہو جاتے تھے اور وعظ کے اثر سے تائب ہونے والوں کی لائن لگ جایا کرتی تھی۔

حضرت مولانا محمد سالم صاحب سے ہمیں تفسیر جلالین کا آخری حصہ، الفوز الکبیر، اور موطا امام محمد پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ پھر جب دارالعلوم میں تدریس کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی تو اس کا آغاز بھی مولانا ہی کے احاطۂ باغ کے اوپر واقع درس گاہ سے اور شرح وقایہ، جلد ثانی کی تدریس سے ہوا۔ مولانا کی تدریس میں بھی خطابت کا رنگ غالب تھا اور وقت کی پابندی اور اصول و ضوابط کی پاس داری میں بھی ان کی کوئی مثال نہیں تھی۔ انتظامی امور سے وہ ہمیشہ بے نیاز رہے اور بغیر طلب یا بغیر کسی

کمیٹی کی رکنیت کے کبھی انہوں نے کسی انتظامی شعبے یا دفتر کا رخ نہیں کیا۔ گھر سے درس گاہ اور درس گاہ سے گھر جانا ان کا ہمیشہ معمول رہا۔

عربی زبان بولنے اور لکھنے پر بھی انہیں قدرت حاصل تھی اور بیرون ملک اور خاص طور پر مصر کی اسلامی امور کی سپریم کونسل کی رکنیت کی وجہ سے اس کے اجتماعات میں وہ برابر شرکت کیا کرتے تھے۔ اور متعدد عالمی کانفرنسوں میں انہوں نے دارالعلوم کی بھرپور نمائندگی کی۔

مولانا سالم کے ساتھ میرا سفر

انسان کے اخلاقی اوصاف خاص طور پر سفر میں زیادہ کھلتے ہیں۔ حسن اتفاق سے مجلس شوری کے فیصلے کے مطابق اجلاس صد سالہ سے پہلے سعودی عرب، کویت اور متحدہ عرب امارات کا سفر مولانا مرحوم کے ساتھ کرنے کا مجھے اتفاق ہوا۔ سفر میں نہایت بے تکلف اور حد درجہ تواضع کے ساتھ ہمیشہ باغ و بہار نظر آتے۔ ذہانت کے ساتھ طبیعت میں ظرافت بھی بے پناہ تھی۔ اس لیے علمی و ادبی لطائف اور نکات سے ہمیشہ محفل کو زعفران زار بنائے رہتے تھے اور اپنی پیش کردہ کسی تجویز کی مخالفت پر ناگواری کا اظہار نہیں کرتے تھے۔

اس سفر میں متعدد نامور شخصیتوں: سعودی عرب کے مفتیِ اعظم شیخ عبد العزیز بن باز، مجلس قضا کے سر براہِ اعلی شیخ عبد اللہ بن حمید، شیخ عبد اللہ بن العُقیل، نام ور ادیب و سفر نامہ نگار شیخ محمد بن ناصر العبودی، کویت میں شیخ عبد اللہ علی المطوّع، وزیر اوقاف جاسم یوسف الحجّی، شیخ یوسف ہاشم رفاعی، امارات کی مجلس قضا کے سر براہ شیخ احمد عبد العزیز آل مبارک وغیرہ سے بے حد دلچسپ ملاقاتیں اور علمی باتیں ہوئیں۔ ریاض کے مجلّہ "الدعوہ" نے دار العلوم کے بارے میں میرا طویل انٹرویو شائع کیا جو مولانا کی معیت اور موجودگی میں لیا گیا تھا۔ اس سفر میں مکہ مکرمہ میں مدرسہ صولتیہ کے سابق مہتمم مولانا شمیم صاحب، مدینہ طیبہ میں قاری بشیر صاحب اور ابو ظہبی میں مولانا تقی الدین ندوی مظاہری خاص طور پر بڑی محبت سے پیش آئے۔

ریاض میں ہم شیخ ابن باز کے دو ہفتے تک مہمان تھے اور وہاں کے کرم فرماؤں میں شیخ محمد ناصر العبودی خاص طور پر بے حد مہربان رہے جن سے ادبی رشتہ پہلے سے تھا اور وہ اپنی بیش قیمت ادبی کتابیں مجھے ہمیشہ بھیجا کرتے تھے۔ مسجد نبوی کے امام شیخ عبد العزیز بن صالح آل الشیخ سے ملاقات کے دوران مولانا سید ارشد مدنی بھی ساتھ تھے جو ان دنوں مدینہ

طیبہ میں تشریف فرما تھے اور انہوں نے مدینہ منورہ کی معروف شخصیت اپنے عم زادہ سید حبیب صاحب کے گھر ناشتے کے لیے مدعو بھی کیا تھا۔ سید حبیب صاحب بڑے وجیہ و بااثر لوگوں میں سے تھے۔ ہندستان میں آبادی کم کرنے کے مؤید تھے۔ اردو بولتے تھے لیکن زبان پر عربی غالب تھی۔

اپنے گھر سے ہی ہم نے جہیمان کے بعض ساتھیوں کو سزا دینے کا منظر بھی دیکھا تھا جن کو کورٹ کے فیصلے کے مطابق سزائے موت دی گئی تھی۔ اور سزا کا نفاذ مختلف شہروں میں عمل میں آیا تھا۔ وہ فتنہ بے حد ہولناک اور سنگین تھا جس کی وجہ سے تقریبا دو ہفتے حرم میں نماز و اذان سے لوگ محروم رہے۔

قاری طیب صاحب کا دار العلوم دیوبند سے ظلماً اخراج

حضرت مولانا محمد سالم صاحب کی زندگی کا ہی نہیں دارالعلوم دیوبند کی پوری تاریخ کا سب سے زیادہ المناک اور صبر آزما مرحلہ وہ تھا جس میں ان کی طرف سے کسی واضح اعلان یا دعوی کے بغیر ہی پیش بندی کے طور پر ان کو

حریف اور خطرناک حریف کی شکل میں پیش کرنے کی سازش رچی گئی۔ اور نہ صرف ان کو نشانہ بنایا گیا بل کہ ان کے والد بزرگوار حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری طیب صاحب کی کردار کشی کی گئی اور ان کے پورے خاندان کے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم شروع ہوئی۔ حضرت نانوتوی کو بھی نہیں بخشا گیا اور میوات کے ایک مولوی نے روزنامہ جمعیت کے ایک شمارے میں اس طرح کے الفاظ لکھنے سے بھی دریغ نہ کیا:

«مولانا محمد قاسم نانوتوی کو قاسم العلوم والخیرات کیوں کہا جاتا ہے؟ انہوں نے کون سے علوم تقسیم کیے؟ چند رسالے لکھے تھے جو نہ اس وقت قابل فہم تھے اور نہ آج قابل فہم ہیں۔ الخ»

ان کے بانی دارالعلوم ہونے کا انکار کیا گیا۔ اندرونِ دارالعلوم طلبہ کو ورغلا کر ہنگامہ آرائیاں شروع کی گئیں۔ مہمان خانے پر لاٹھی ڈنڈوں کے ساتھ پڑھائی کی گئی جس کے بعد شوری کی اگلی نشست ڈاک بنگلہ پر اور اس سے اگلی نشست علی گڑھ منتقل کی گئی اور دُہائی شوری کی دی جاتی رہی۔ راگ شوری کی بالادستی کا الاپا جاتا رہا اور مقصد صرف یہ تھا کہ کسی طرح مولانا محمد سالم صاحب حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب کے بعد ان کے جانشین کی حیثیت سے مہتمم نہ بن پائیں۔

اس مہم کو انجام دینے کے لیے چند مقدّس شخصیتیں بھی میدان میں آ گئیں اور اس وقت تک انہیں چین نہ آیا جب تک کہ خود حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کو منصب اہتمام سے بے دخل نہیں کر دیا۔ چنانچہ وہ ہوا جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

دراصل تصوف میں سیاست کی آمیزش ہو جائے تو دو آتشہ بن جاتی ہے جس سے ہر طرح کے جرم کی پردہ پوشی کی جاسکتی ہے اور ہر غلط کام کو صحیح ثابت کیا جاسکتا ہے۔ اور خطرناک سے خطرناک مہم کو اس چابک دستی اور صفائی سے انجام دیا جاسکتا ہے کہ بسمل تڑپتا رہے لیکن قاتل کے تقدس پر حرف نہ آئے۔

برصغیر میں دینی مدارس اور دینی جماعتیں عوامی چندوں سے قائم ہیں اور قائم کرنے والوں اور انتظام وانصرام کرنے والوں کی محنت لگن اور خلوص سے وہ ترقی کی منزلیں طے کرتی ہیں۔ ہندستان کے سبھی معروف دینی مدارس مظاہر العلوم سہارن پور، دار العلوم ندوۃ العلماء، اہل کاندھلہ کی جماعت تبلیغ، دہلی کی جمعیت علماء ہر جگہ کا نظام اہل خاندان ہی میں عموماً دائر و محصور چلا آرہا ہے اور اسے ادارے کی ترقی کا ضامن سمجھا جاتا ہے۔ لیکن دیوبند میں اس بات کو ناقابلِ برداشت سمجھا گیا کہ حکیم الاسلام مولانا

قاری محمد طیب صاحب کی جانشینی مولانا محمد سالم قاسمی کے حصے میں آجائے۔ اور وہی مقدس ہستیاں جو اپنے اداروں میں کسی اور کا سایہ بھی برداشت نہیں کرسکتی ہیں، دیوبند میں انقلاب کی قیادت کرنے لگیں۔ اور اس کے لیے ہر طرح کے حربے استعمال کیے گئے۔ ہنگامہ آرائیوں کی پشت پناہی کی گئی اور حضرت قاری محمد طیب صاحب کی ساٹھ سالہ خدمات کا صلہ ان کے خلاف بے بنیاد الزام تراشیوں کی شکل میں دیا گیا اور ایک تلون مزاج بزرگ نے انکی ذہنی صلاحیت کے بارے میں غیر ذمہ دارانہ تحریر لکھی جو خود ان کے اپنے ذہنی واخلاقی دیوالیہ پن کا ثبوت تھی۔ اور باالآخر انہیں منصب اہتمام سے بے دخل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔

یہ وہی حکیم الاسلام ہیں جو مولانا قاسم نانوتوی کے حفیدِ سعید اور ان کے وھبی ولدُنی علوم کے وارث وامین تھے، جنہوں نے دارالعلوم کو دارالعلوم بنانے میں اپنی ساری زندگی وقف کردی اور اپنی بے مثال خطابت اور غیر معمولی علم وحکمت کے ذریعے دنیا کے چپے چپے میں دارالعلوم کی عظمت کا نشان قائم کردیا اور جن کی پاکستان سے واپسی پر ان کا استقبال کرتے ہوئے شیخ الاسلام سید حسین احمد مدنی نے دارالعلوم میں ان کی ضرورت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا:

اے تماشا گاہ عالم روئے تو

تو کُجا ہر تماشا می روی

(آپ کا چہرا تو خود ساری دنیا کے لیے زیارت گاہ ہے۔آپ کہاں تماشہ دیکھنے چلے گئے تھے؟)

اور جن کا ایک ایک خطاب ان کے معاصرین کی کئی کئی اہم تصنیفات پر بھاری ہے۔

مولانا سالم کا صبر و استقامت

مولانا محمد سالم صاحب کے سر سے اتنا بڑا سانحہ گُزر گیا لیکن ان کے پائے استقامت میں ذرا لغزش نہ آئی اور نہ ان کے عزم و ہمت میں کوئی فرق آیا۔ انہوں نے بڑی بے نیازی اور استغنا کے ساتھ عہد رفتہ کو فراموش کر دیا اور جاہ و منصب جس سے ان کو غاصبانہ طور پر بے دخل کیا گیا تھا اس پر ماتم کرنے کے بجائے یہ کہتے ہوئے وقف دارالعلوم کے نام سے نیا مے خانہ آباد کر لیا کہ:

گلہ نہیں جو گریزاں ہیں چند پیمانے

نگاہِ یار سلامت ہزار مے خانے

آج دار العلوم دیوبند کا جسم تو پھولا ہوا نظر آتا ہے مگر ...

گلشنِ قاسمی کو آباد رکھنے کے لیے نہ جگہ کی قید ہے، نہ عمارتوں کی ضرورت، بل کہ قاسمی روح کو تو یک گونہ بے سر وسامانی سے ہی تسکین ملتی ہے اور قلندری ہی میں اسے طاقت و قوت محسوس ہوتی ہے۔ خود دارالعلوم کی تاریخ اصول ہشت گانہ کی زندہ تصویر اور حضرت نانوتوی کی زندہ کرامت رہی ہے کہ وسائل کی فراوانی اور امیرِ محکم القول کا وعدہ اس چراغ کو بے نور وضیا کر دے گا۔ چنانچہ اس کا وہ زمانہ بھی تھا جس میں علامہ انور شاہ کشمیری اور مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا اشرف علی تھانوی پیدا ہوئے اور وہ وقت بھی آیا جب اس کے احاطے میں اقتدار کی جنگ لڑی گئی اور علم و حکمت، تہذیب و شرافت سب کا خون کیا گیا۔ چنانچہ آج جسم تو پھولا ہوا نظر آتا ہے لیکن اس روح کی تلاش ہر سو جاری ہے جو وہاں کا امتیاز رہی ہے۔

اس سلسلہ کی ایک دلچسپ گفتگو وہ ہے جو میرے سامنے ہوئی۔ پٹنہ میں امارت شرعیہ کا اجلاس تھا۔ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا سعید اکبر آبادی، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، حکیم محمد زماں حسینی صاحب اور دیگر اکابر شریک تھے۔ چائے کے وقفے میں اچانک مولانا محمد ولی رحمانی صاحب سامنے آئے تو (ان کے والد) حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب نے حضرت قاری محمد طیب کے سامنے ان کو پیش کرتے ہوئے فرمایا:

«یہ میاں محمد ولی ہیں، جامعہ رحمانیہ مونگیر کا نظم و نسق یہی سنبھالے ہوئے ہیں۔»

وہ زمانہ دارالعلوم دیوبند میں سخت ہنگامہ آرائیوں کا تھا تو حضرت قاری صاحب نے از راہ ظرافت چٹکی لیتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے فرمایا:

«اس سے وراثت تو قائم نہیں ہوتی؟»

مولانا رحمانی نے فرمایا: «جی حضرت! ہوتی ہے۔ اور میں نے اب سے پندرہ (۱۵) سال پہلے آپ کو یہی مشورہ دیا تھا لیکن آپ نے تکلف سے کام لیا اور فرمایا کہ میرے خاندان کا امتیاز علم ہے، انتظام نہیں۔ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے اور وہاں کے حالات پر قابو مشکل ہے۔ میں نے کام اُن (صاحب زادے) کے سپرد ایسے وقت میں کیا ہے کہ میں ان شاء اللہ اسے سنبھال سکتا ہوں۔»

آج کی نمائشی شوری اور قاری طیب کے زمانے کی با اختیار شوری

عام طور پر دینی اداروں میں مجلس شوری کا جو حال ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ لیکن دار العلوم دیوبند کا معاملہ حضرت قاری صاحب کی بے نفسی اور علمی و اصلاحی امور میں انہماک کی وجہ سے استثنائی قسم کا تھا۔ اور باوجود یکہ وہاں کی مجلس شوری کا دار العلوم کے مالی امور میں استحکام یا وقت اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق تعلیم میں کسی بڑی اصلاح کے معاملے میں کچھ زیادہ موثر رول نہیں رہا ہے اور اس کا کام محض اخراجات کی نگرانی، ملازمین کی تعیین وغیرہ تک منحصر رہا ہے لیکن مہتم کے ساتھ معاملہ اور طرزِ عمل کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک دن مولانا رحمانی صاحب شوری

کی نشست سے لوٹے تو دیر ہو چکی تھی۔ فرمانے لگے کہ آج تیسرا دن ہے اور ابھی تک ایجنڈے پر بحث پوری نہیں ہو سکی ہے۔

پھر فرمانے لگے کہ ہم لوگ حضرت قاری صاحب سے ایک ایک اینٹ کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ حضرت قاری صاحب کا مزاج علمی ہے۔ بعض دفعہ لمبی نشست اور چھوٹی چھوٹی باتوں کے بارے میں سوال سے زچ ہو کر اٹھ جایا کرتے ہیں۔ پھر فرمانے لگے کہ میں بعض دوسرے بڑے اداروں کی مجلس انتظامیہ کا بھی رکن ہوں اور وہاں کا حال یہ ہے کہ عصر کے بعد نشست شروع ہوتی ہے۔ ہمیں ایک تفصیلی رپورٹ پڑھ کر سنادی جاتی ہے، پھر چائے ہوتی ہے۔ اس کے بعد مغرب سے پہلے ہمیں نہر کے کنارے چہل قدمی کا موقع مل جاتا ہے۔

مولانا سالم کا صبر و سکوت ان کے عظمت کی دلیل ہے

حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب کی علمی قابلیت، خطابت میں امتیاز، تدریس میں کمال اور تصنیف و تالیف کے ذوق کے ساتھ ساتھ زندگی کے مسائل میں بے نیازی کا وصف اور سخت و سنگین حالات میں بھی ثابت قدم

رہنے کی ادا ایسی ہے جو ان کی شخصیت کو چار چاند لگاتی ہے۔ دار العلوم کے منصب اہتمام کا مسئلہ دوسروں نے پیدا کیا۔ خود ان کی طرف سے کبھی کسی رد عمل کا اظہار نہیں ہوا۔ محض ان کو اُس سے دور رکھنے کے لیے پروپیگنڈے کی زبردست مہم شروع ہوئی۔ ہر طرح کے اوچھے حربے استعمال کیے گئے لیکن دفاع کیلئے نہ کبھی ان کی زبان کھُلی اور نہ قلم حرکت میں آیا۔ یہ ان کی عظمت کی سب سی بڑی دلیل ہے۔

دار العلوم کے منصب اہتمام پر فائز نہ ہونے سے ان کا قد چھوٹا تو نہیں ہوا، البتہ اس منصب کی قد ضرور کم ہوئی۔ اور حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب کا بدل پھر اسے میسر نہ آ سکا۔

آج جب مولانا محمد سالم صاحب اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں تو ہر شخص کی زبان پر ان کے بارے میں تحسین و آفرین کے کلمات ہیں اور ہر کوئی ان کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ اور ان کا جنازہ اس شان سے اٹھا کہ ائمۂ دین کی یاد تازہ ہو گئی۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

دنیا کے جاہ و منصب کی حیثیت کیا ہے اس کو حضرت حکیم الاسلام نے بڑے لطیف انداز میں بیان فرمایا ہے۔

اکبر الہ آبادی کی مشہور رباعی ہے:

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے

یعنی جینا اور مرنا ہے

اب رہی بحث رنج و راحت کی

وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

اس پر حضرت مولانا قاری طیب صاحب کی تضمین ہے:

رہ گیا عز و جاہ کا جھگڑا

یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے

مقصد زندگی ہے طاعتِ حق

نہ فکرِ جہاں میں پڑنا ہے

تقدس کے لبادے میں کھیل

دارالعلوم دیوبند کے احاطے میں جو کچھ ہوا اور تقدس کے لبادے میں جو کھیل کھیلا گیا، ظلم وزیادتی اور ناانصافی و حق تلفی کی جو داستان رقم کی گئی ہے، وہ یقیناً علم واخلاق کا دم بھرنے والوں اور دین کی نمائندگی کا دعوی کرنے والوں کے نام پر کلنک کا ٹیکا ہے۔

اب اس ڈرامے کے سارے ہی کردار رب کائنات کی عدالت میں پہنچ گئے ہیں جہاں سینگ والی بکری سے بے سینگ کی بکری پر زیادتی کا انتقام لیا جائے گا اور جہاں نہ عیاریاں چھُپ سکیں گی اور نہ مگرمچھ کے آنسو کام آئیں گے:

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر

لہو پکارے گا آستیں کا

اب ضرورت مولانا کی یادگار اور ان کی قوت عمل اور عزم و حوصلہ کے شاہ کار وقف دارالعلوم اور حجۃالاسلام اکیڈمی کی تقویت کی ہے۔ یہ دونوں (بزرگوں) کے لیے صدقۂ جاریہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں حضرت نانوتوی کا پرتو دیکھا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور :

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے (آمین)